مختار مسعود

داستانِ اشتیاق

میں نے آٹو گراف البم بند کر دی۔ خلاء میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ ذہن البتہ ایک خاص نقطہ پر جما ہوا تھا۔ مجھے اس لمحے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا ہٹیلا اور سر پھرا تھا مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ طبعیت ایسی پائی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ ڈانٹ کھا کر فوراً اسی کام میں لگ گیا جس سے اسے منع کیا تھا۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ ڈانٹنے والا زچ ہو کر بولا بھلا تم کب باز آنے والے ہو، تم سے بھلمنسات کی امید کون رکھے۔ تم تو احراری ہو احراری۔ یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سنا۔ اور اسے بدی کا ایک استعارہ سمجھ لیا۔ چند دنوں بعد میں جب میں نے سنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں۔ اور اقبال کے کلام میں مرد مومن کے ساتھ مردان حُر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شبہ پیدا ہو گیا۔ اس شبے کو پیر جو گوٹھ کی گدی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں سبھی حُر کہلاتے ہیں کچھ مدت اور گزری تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پر اثر ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی۔ مگر اس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔ الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا ظاہر دار بیگ ہوتے ہیں ان کے معنی وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم، مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً حسن و عشق، تیسرے وہ تہہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مفہوم کبھی گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استحصال۔ اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ میں شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعت احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوع، بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احراری کہلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سر کردہ افراد بھی تھے اور سر کش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے۔ اور اس انجمن کا نام مجلس احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلس احرار کا قافیہ بیزار، اشرار، غلط کار چندے کے طلبگار اور

رسوا سر بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیر شریعت کہتے ہیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کئی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں یوں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور خلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار منشی عبدالرحمان خاں سے کر دیا۔

مجلس احرار کو غیر قانونی قرار دیئے ہوئے چھے سال ہو چکے تھے۔ جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخاست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر اوجھل، جلوس منتشر ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یادگاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فرو گزاشتیں اور میر مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نشیں ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانون وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانون قدرت نے جو ہر بوڑھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی۔ خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرأت، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو، اور تضمیح کو حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ یہ کام برسر عام ہو رہا ہے یا برسر منبر۔

شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ خم کھایا۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہو گی۔ جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابوالکلام آزاد الہلال نکالتے اور امام الہند کہلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نواب اور جاگیردار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکھا تھا پٹنہ میں داغ یتیمی، بنارس میں ورق کوٹنے کی مشقت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی کو جس نے سنا اس نے یہی کہا۔

چہ جادوئیست ندانم بطرزِ گفتارش
کہ باز بستہ زبان سخن طرازاں را
(فیضی)

ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اردو زبان کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایہ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہونگے۔ جن کے لئے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو

بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو واپسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں ضابطہ فوجداری حرکت میں آیا۔ جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائل ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حائل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور ضابطے حائل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر نہ سنی تو کل کیسے سن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصہ بن چکے ہوں گے جہاں حسن انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالف کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے۔ اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبدالرحمان خاں کے ذمہ تھی۔ انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ ٹال گئے۔ کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا دیکھئے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابل ملامت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے ان کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انہیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دور حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہشمند ہے اور بوڑھا خطیب اس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں۔ بس اتنا سن کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظ مراتب کا سوال تو میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سنیں اور الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ اگلے ہی روز سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے میں نئے موڈل کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے ایک پھرکتا ہوا فارسی شعر بر آمد ہوا اور اس کے پیچھے شعر پڑھنے والا اترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، سبز چار خانہ تہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو، شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا دوسرے سے کچھ بوجھ اپنے عصا پر ڈالا۔ کمر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اتاری اور پالتی مار لی۔ میں نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ان کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تھوڑی سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ لحیم شحیم گیسو دراز اور عصا بردار جسے دیکھ کر دیو جانس کلبی، برنارڈ شا، ٹیگور اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ ستا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبان خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے ان کی تقریر سنی اور پسند کی اس کے لئے علم حاضر اور

جس نے کبھی نہ سنی مگر اوروں سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لئے ایمان بالغیب۔ شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور میرے جذبات کا احترام کیا وہ ذرا سی دیر میں یوں گھل مل گئے گویا میری نیازمندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ان کی بیماری اور کمزوری کے پیش نظر میں نے اسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو شام ہو چکی تھی۔ اور شاہ جی کو آئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ لمحہ بھر کے لئے بھی منقطع نہ ہوا اور اس میں میرا حصہ اسی قدر تھا جتنا ایک میزبان اور سامع کا ہونا چاہیئے۔ منشی صاحب محض سننے اور سر دھننے کے قائل نہیں ان کا اصول ہے کہ اچھا لسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ ان سے تنہا فائدہ اٹھانا کم ظرفی کی دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو منشی صاحب مسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر کاغذ نکالا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے وہ جو ایک نوجوان اور تھا وہ تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر یوں دبے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چٹکلوں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی۔ وہاں تاریخ کا ذکر آ گیا اور اس میں مختلف تحریکیں شامل ہو گئیں۔ ہر تحریک کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا۔ اور بات ایک پورا چکر لگا کر شاہ جی کی ذات پر واپس آ گئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی ملاقات ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت شاہ جی جوتیاں اتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے ابھی وہ پیر نیچے اتاریں گے چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کی ڈبیہ جیب میں ڈالی جائے گی اور پھر عصا کا سہارا لے کر اٹھیں گے جو تمام عرصہ ان کے ہاتھ ہی میں رہا تھا میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ اپنی تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ وہ گفتو جسے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے۔ اور اس کا تاثر دل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظے پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظہ بھی خواہشات کا تابع ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سود و زیاں کے بارے میں تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں آپ نے بر عظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے۔ یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں

نے دوسرا سوال پوچھا۔ برعظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ الجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم مایہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ جو ملی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملا تھا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہو گا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہو سکی کہ دو سو برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے آئے۔ جنگ آزادی کی ہمہ ہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی۔ جو لوگ باقی رہے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیر اثر رہ کر گمراہ ہو گئے صرف پچھے کھچے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تھا مگر نسل ناخوب تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے آبائی ورثہ بھی کھویا اپنی کمائی بھی گنوائی اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہو گی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی میں آزردگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹو گراف البم ان کے سامنے کر دی شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اول
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجود اول
اور گیاہِ رہ گل رخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔ یہ بات ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کی ہے۔ دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمن خاں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنجر زمین کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے تھے۔ آج ہم ان کے سرہانے خاموش کھڑے تھے۔ قبر سے آواز آئی۔ تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز نہ دے سکا تھا لو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا:

مسلم ہندی چرا میداں گزاشت ہمت او بوئے کراری نداشت!
مشت خاکش آنچناں گرد دیدہ سرد گرمیٔ آوازِ من کارے نہ کرد!